

ادارتی صفحہ

EDITORIAL

قومی سلامتی کا تقاضا

گزشتہ ماہ دہشت گردی کے حوالے سے رواں سال کا سب سے خونریز مہینہ ثابت ہوا۔ ملک میں سکیورٹی صورتحال پر نظر رکھنے والی ایک تنظیم کی رپورٹ کے مطابق اس مہینے کم از کم آٹھ خودکش حملے ہوئے جن میں سے پانچ میں بارود بھری گاڑیوں کو استعمال کیا گیا تھا۔ جولائی میں دہشت گردی کے واقعات میں سکیورٹی فورسز کے کم از کم 112 ہلاک اور 93 عوامی شہری شہید ہوئے۔ جون میں یہ تعداد باترتیب 52، 26 اور 51 تھی۔ قابل غور بات یہ ہے کہ شہید ماہ ہلاک ہونے والے دہشت گردوں کی تعداد بھی رواں سال کے کسی سترے مہینے سے گنتھی۔ جولائی میں 401 دہشگرد ہلاک ہوئے جبکہ جون مئی میں باترتیب 184 اور 270۔ بلوچستان اور خیبر پختونخوا دہشگردی کے نشانے بنے۔ ہفتے کے روز شمالی وزیرستان میں دہشگردی کے ایک واقعے میں پاک فوج کے ایک میجر بہادری سے لڑتے ہوئے جام بھری نوش کر گئے جبکہ انوار کے روز سوات کے علاقے میں دہشگردی کے واقعے کم از کم پانچ پولیس اہلکار شہید ہو گئے۔ بلوچستان اور خیبر پختونخوا دہشگردی کا مسلسل ہدف ہیں۔ بظاہر اس کی پہلی اور بنیادی وجہ ان صوبوں کی جغرافیائی صورتحال ہے۔ ہر دو صوبوں کی سرحدیں افغانستان سے ملتی ہیں اور افغانستان اس وقت عملاً فتنہ انچوران اور فتنہ اہندوستان کا ٹھکانہ ہے۔ افغانستان سے یہ توقع کی گئی تھی کہ دو دہائیوں کی جنگ کے بعد وہاں کا اقتدار امنیائے والے نئی شرائط کریں گے اور خطے کے ممالک کے ساتھ بھائی چارے کے اصولوں کو ترجیح دیں گے مگر حقیقت اس کے برعکس ہوا اور اگست 2021ء سے کابل پر مسلط طالبان نے وہیں سے کام شروع کیا جہاں وہ دہ ہائی پہلے چھوڑ کر گئے تھے۔ پاکستان اور خطے کے دیگر ممالک کی خواہش تھی کہ افغانستان کو برہمن دم دفر، ہم کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا جائے مگر طالبان کی عبوری حکومت نے ہمسایوں کے خلوص کا یہ صلہ دیا کہ آتے ہی دہشگرد دوں کو کیلوں سے چھوڑنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً پاکستان میں دہشگردی میں 2021ء کے وسط سے اضافے کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ آج پانچ سال بعد بھی اسی طرح جاری ہے۔ سکیورٹی فورسز نے ان دہشگردے ہوئے خطرات کا بھرپور سامنا کیا اور اقتصاد و دہشگردی کے مسلسل کارروائیوں کا نتیجہ یہ ہے اس خطرے کو ماضی کی طرح ملک بھر میں پھیلنے سے روکا گیا ہے۔ دہشگرد دوں کے ٹھکانوں پر چھاپے مار کارروائیاں مسلسل جاری ہیں اور سکیورٹی فورسز کا زیادہ تر جانی نقصان انہی کارروائیوں میں ہوا ہے۔ ان جراثیم نندنا اقدامات کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے دیگر حصے دہشگرد دوں کے حملوں سے محفوظ ہیں۔ البتہ ضروری ہے کہ خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں بھی امن بحال اور ان علاقوں میں معاشی ترقی کے امکانات کو فروغ دیا جائے مگر یہ اسی صورت ممکن دکھائی دیتا ہے جب خطرے کو اس کے نقطہ آغاز پر روکا جائے اور وہ افغانستان ہے جہاں کی عبوری انتظامیہ اس ذمہ داری کے احساس سے بے بہرہ ہے۔ ماضی میں پاکستان نے نیٹو راسی کو ششیں کیں کہ طالبان اس ذمہ داری کو پورا کریں مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ الٹا طالبان کی عبوری حکومت دہشگرد دوں کے ساتھ کھڑی ہو گئی جس پر افواج پاکستان کو افغانستان میں خطرے کے مقامات کو نشانہ بنانا پڑا۔

نئے انتظامی یونٹس کی تشکیل کا مطالبہ

ملک میں گڈ گورنس اور نئے انتظامی یونٹس کی تشکیل کا مطالبہ بڑا چکا ہے۔ پچھلے کچھ عرصے میں اس حوالے سے سیاسی عوامی اور رائے ساز حلقوں میں قوتاً سے گفتگو ہوئی اور نئے انتظامی یونٹس کی ضرورت و اہمیت کا مقدمہ موثر طور پر سامنے آیا۔ صورتحال یہ ہے کہ اس وقت قومی سطح پر شاید یہی کسی دوسرے تصور کو اتنی توجہ حاصل ہوئی ہو جتنی کہ نئے انتظامی یونٹس کی تشکیل کے تصور کو حاصل ہے۔ عوام اور سیاسی حلقوں کو اس حقیقت کا اچھی طرح اندازہ ہے کہ ملک کے انتظامی خدوخال اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ناگزیر ہو چکا ہے۔ ملک عزیز کے صوبوں کا غیر معمولی حجم اچھی حکمرانی کیلئے ایک بنیادی رکاوٹ رہا ہے۔ حکمرانی یعنی عوام کے قریب ہونے والی اتنی ہی موجود تر اور نتیجہ خیز ہوگی لیکن ہمارے ہاں چاروں صوبوں کا سب سے کراں پھیلاؤ اس میں ملے جے جو جرم میں دینا کے بڑے ہوئے زائد ممالک سے بڑے ہیں۔ صوبوں کے غیر معمولی پھیلاؤ کی وجہ سے حکمرانی کا نظام اپنی بساط سے نہیں زیادہ پھیل چکا ہے اور اس کے نتیجے میں موجود شرکرائی نامکن ہو چکی ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم



جماعتوں کو ہماری وابستگی سے محروم رکھا۔ سیاسی جماعتیں نے صوبوں کو انتظامی بنیادوں پر چھوٹے یونٹس میں تقسیم کر دیا ہوتا اور ہر یونٹ اپنے آپ میں ایک صوبے کی طرح وسائل اور اختیارات کا حامل قرار پاتا تو یہ مسائل نہ ہوتے۔ عوامی معاشی اور سیاسی تقاضوں کو اٹھانے میں ڈال کر سیاسی جماعتوں نے آزادی اور رقبہ پر اپنی سیاسی پکڑ برقرار رکھی مگر بنیادی مطالبات کو ہمیشگیلئے سرورخانے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ انتظامی تقسیم اور وسائل کی منصفانہ

روزنامہ "قوت" لاہور (54) اگست 2026ء

منطقی بھی اسی قسم کا جائزہ اور منطقی مطالبہ ہے۔ اس سلسلے میں لیت و دلت حکمرانی کے ابہام، عوامی تحریکوں میں امنائے اور ملکی پر عدم استحکام کا سبب بنے گا۔ اٹھارہویں آئینی ترمیم کے تحت صوبوں کا مالی کردار ایک مرکب صوبائی عوام اور وسائل کی منصفانہ تقسیم سے محروم رہے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ صوبائی سطح پر بحر و محروم میں اضافہ ہوا۔ حکمرانوں کی ترجیحات اور رپیں اور عوامی اٹھارہویں آئینی ترمیم کے تحت صوبوں کو وسائل مہیا کرنے کا منشا ہے تھا کہ اس کے ثمرات عوام تک پہنچیں ہوں گے مگر ان صوبوں میں افلاس ہے روزگار کی تعلیم اور صحت کی اہتر صوبوں میں واضح کیے دیتی ہے کہ پچھلے سولہ برسوں میں کوشش کر رہا تھا کہ ایک استان کا ہر چہ اٹھنا ہو تا مین ایک انتظامی یونٹ نہیں بلکہ ان ہزاروں نو جوانوں کے ساتھ نا انصافی ہے جو برسوں کی محنت کے بعد اپنے مستقبل کی امید ایک استان سے وابستہ کرتے ہیں اس سے بڑا سوال ہے۔ ملکی آبادی میں نو جوانوں کی اکثریت ہے مگر ان کی ترقی کے وسائل دستیاب نہیں۔ اس محرومی نے صرف آج کی نسل کو نہیں آئندہ نسلوں کو اور پاکستان کے مستقبل کو بھی داغ پر لگا دیا ہے۔

تحریک ڈاکٹر سید راشد علی شاہ پچھلے چند دنوں میں بھارت کے نو جوانوں کو دیکھتے اور سنتے ہوئے مجھے بار بار ایک عجیب سا احساس ہوا۔ یہ محض ایک احتجاج، کسی احتجاجی سازشے، کسی پرپے کے افشا ہونے یا کسی سرکاری فیصلے کے خلاف غصے کا معاملہ نہیں تھا۔ میرے لیے اس پورے منظر میں سب سے زیادہ متاثر کن چیز ان نو جوانوں کا غصہ یا احتجاج نہیں، بلکہ ان کا شعور تھا۔ میں نے ان میں سے کئی نو جوانوں کو بولے۔ نا کوئی تاریخ کا حوالہ دے رہا تھا، کوئی آئین اور بنیادی حقوق کی بات کر رہا تھا، کوئی میرٹ اور انصاف کا سوال اٹھا رہا تھا، کوئی ریاست اور شہری کے فکلت پر بات کر رہا تھا، اور کوئی یہ کہہ رہا تھا کہ اس کا ایک استان کا ہر چہ اٹھنا ہو تا مین ایک انتظامی یونٹ نہیں بلکہ ان ہزاروں نو جوانوں کے ساتھ نا انصافی ہے جو برسوں کی محنت کے بعد اپنے مستقبل کی امید ایک استان سے وابستہ کرتے ہیں اس سے بڑا سوال ہے۔ ملکی آبادی میں نو جوانوں کی اکثریت ہے مگر ان کی ترقی کے وسائل دستیاب نہیں۔ اس محرومی نے صرف آج کی نسل کو نہیں آئندہ نسلوں کو اور پاکستان کے مستقبل کو بھی داغ پر لگا دیا ہے۔

یہ بچے ہمیں کچھ سکھا رہے ہیں

توہین آزیم زبان استعمال کی گئی۔ میرے لیے کسی نو جوان کو کھس اس لیے کٹر سمجھتا کہ وہ اقتدار سے سوال کر رہا ہے، صرف ایک فردی توہین نہیں۔ یہ اس شعور کی توہین ہے جسے ایک زندہ تعلیمی نظام کو پیدا کرنا چاہیے۔ لیکن شاید اسی مقام پر اس پورے واقعے کا سبب سے متاثر کن پہلو بھی سامنے آیا۔ نو جوانوں کا غصہ توہین نہیں ہوتے۔ انہوں نے جواب دیا، مگر صرف نفروں سے نہیں۔ انہوں نے دلیل سے جواب دیا، تاریخ سے جواب دیا، قانون، سیاست، سماج، انصاف اور اپنے بنیادی حقوق کے شعور سے جواب دیا۔ اور مجھے سب سے زیادہ بھی چیز متاثر کر گئیں ایک استاد ہوں اور میری زندگی کا بڑا حصہ تعلیم، تدبیریں اور طلبہ کے درمیان گزارا ہے۔ شاید اسی لیے جب میں کسی نو جوان کو بولتے ہوں تو کہتا ہوں تو صرف اس کے الفاظ نہیں سنتا، بلکہ ان الفاظ کے پیچھے موجود تعلیم کو بھی دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس طالب علم کی بات ہے، وہ اپنے ارد گرد کے معاشرے کو اس نظر سے دیکھتا ہے اور اس کے اندر چیزوں کو سمجھنے کی خواہش بھی گہری ہے۔

لیفٹیننٹ جنرل احمد شریف کی گفتگو کے دوسرے حصے پر غور کیا جائے جس میں انہوں نے "ہارڈ اسٹیٹ" کا نظریہ پیش کرنے کے بعد ملک کے ساتھ وفا داری کا سبق یاد کرانے کی کوشش کی تھی تو مجھے سن آسانی ہوگی۔ ان کا کہنا تھا کہ لوگ اپنے حقوق کی بہت بات کرتے ہیں لیکن کبھی یہ سوال نہیں کرتے کہ ان کے رٹائن کیا ہیں؟ شاید ان کا یہ سوال درست ہو لیکن پاک فوج کے ترجمان کی معلومات کے لیے یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے کہ حقوق و فرائض میں توازن کی بات کی گئی وہ ذمہ دار جمہوری نظام میں تسلسلے کی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ یقینی بنایا جاتا ہے کہ ریاست اور اس کی نمائندگی کرنے والا ہر فرد اور ادارہ بھی فرائض ادا کرنے میں نمایاں مثال کے طور پر سامنے آئے۔ مثلاً پولیس کو شہریوں کی حفاظت کے لیے غیر معمولی اختیارات دیے جاتے ہیں لیکن اس بھی بے اعتباری پر پولیس کے احتساب کا کڑا نظام بھی استوار ہوتا ہے۔ کسی شہری کو اس بنا پر مقاب کا ہدف نہیں بنایا جاتا کہ اس نے پولیس افسر کو چیلنج کیا تھا، کسی بارہائی کے خلاف غرہ لگایا تھا کسی ایسے مطالبے کی حمایت کی تھی جو ریاست کی مروجہ پالیسی کے برعکس تھا۔

عوامی شعور، تاریخی جبر اور معاشرتی جمود

کو خارج کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کا نو جوان اگر آئینی حقوق کی پامالی دیکھے تو وہ جنت زمزمہ پر یا یونیورسٹی کے پیس سڑکوں پر نکل کر ریاستی پالیسیوں کے سامنے بند ہانڈے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان کی کہانی روز اول سے ہی مختلف رخ اختیار کر گئی۔ قیام پاکستان کے محض ایک ہفتے بعد 12 اگست 1947ء کو مسوہر صدر مئی خیر پختونخوا میں ڈاکٹر خان کی ختف حکومت کی برطانی نے اس بات کا اشارہ دے دیا تھا کہ نئے ملک میں اختلاف رائے اور مزاحمت کو کسی نظر سے دیکھا جائے گا۔ وہ لوگ جنہوں نے انگریز سامراج کے خلاف جی توڑ جدوجہد کی تھی اور جو مزاحمت کی علامت سمجھے جاتے تھے انہیں دھیرے دھیرے دیوار سے لگا دیا جائیگی اور ان کی زوال کا اگلا مرحلہ اس وقت آیا جب 11 اگست 1947ء کے قائد اعظم کی تاریخی تقریر پر یونٹس پشت ڈال دیا گیا جس میں ریاست کو مذہب سے بالاتر کر کے تمام شہریوں کے مساوی حقوق کا منشور دیا گیا تھا۔ اس کے چند ہی ماہ بعد قرارداد مقاصد کی منظوری نے سیاست میں مذہبی طبقات کے اس کردار کی بنیاد رکھ دی جس نے وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی اور معاشی شعور کو ہر طرح منظر بن گیا۔ پھر کوٹ شاہی اور فوجی آمریت کے گھمبیرے دور کا نام زمر یاں بند کر دیں جہاں سے سیاسی شعور اور عوامی قیادت نے جنم لیتا تھا۔ خاص طور پر جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں جو معاشرتی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا

حالیہ طوفانی بارشوں

ہدایات جاری ہیں بلکہ کسانوں کا اعتماد بحال کرنے کے لیے خزانہ کے موبائل بھر دی گئی۔ نوٹ کیے تاکہ براہ راست راستہ رکھا جائے اور کسی قسم کی غفلت یا کوتاہی کی بخشش نہ رہے۔ یہ یقین دہانی بھی کروائی گئی کہ ایک دو دن کے بارشوں کا مکمل ٹکاس یقینی بنایا جائے گا اور بارشوں کو کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا نا پڑیں گے۔ مگر وہی ہوا جس کا ہمیشہ سے ڈر رہتا ہے؛ "میدی اگلی سے کھی نہ ٹفٹے" کے مصداق معاملات جوں کے توں رہے۔ مشکلات، پریشانی اور فضلوں کے نقصان کے اس عذاب کے ساتھ ساتھ اب کسانوں کو انتظامیہ کی مہینہ وعدہ خانی کا بلوچھی اٹھانا پڑا ہے۔ جن لوگوں کو ان کی زرانی کی گئی تھی ان کے مسائل کچھ چٹھنوں کی بات ہیں، وہ اس امید پر سانسوں کی ڈوری تھامے بیٹھے تھے کہ شاید انتظامی مشینری کوئی مجرہ کر دکھائے گی۔ لیکن جب سچ آکھلی اور سول میڈیا پر متاثرہ کسانوں کے پڑاؤں احتجاج کے مناظر دیکھے تو دل خون کے آنسو رو پڑا۔ بلاشبہ، ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ ایک اچھے اور صلاحیت افر ہیں، جو انتظامی امور کی بہترین انجام دہی کی شہرت

تحریک۔ خالد بٹ حالیہ طوفانی بارشوں نے پورے پنجاب ہاٹھیں دیہی علاقوں اور زرعی معیشت کو کس بے دردی سے اپنی لپیٹ میں لیا ہے، اس نے کسانوں اور زمینداروں کی کمر توڑ رکھ دی ہے۔ ان کے درویشوں کے کھیتوں کو دیہی علاقے بھی آکھلی آفت کی زد میں آئے، جہاں ہزاروں ایکڑ پر پھیلا فضیل اور زرعی اراضی زیر آب آچکی ہے۔

کسانوں کی اس دردناک صورتحال پر جب آزاد آگئی تو منظر کے کزن قومی آئینی بال فاروق تارڑ نے کسان بھڑاؤں کو ساتھ لے کر ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ سے ملاقات کی اور انہیں اس سنگین صورتحال سے تشکیل طور پر آگاہ کیا۔ اس بروقت اقدام کے نتیجے میں روز ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ، اسسٹنٹ سٹیشن ڈیڑہ آباد اور دیگر مقام متعلقہ محکموں کے ذمہ دار افسران کے ساتھ دو گھنٹہ کے اس مٹا رہے خٹلے میں بیٹھے۔ وہاں موجود زمینداروں اور متاثرہ اراضی مالکان نے اپنی ہڈیاں کا دینے والی برہنہاؤں اور لالحوں کے نقصانات کا احوال خود کا مکالمہ کیا۔ اس موقع پر ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ نے نہ صرف موقع پر موجود مانت افسران کو فوری اور سخت

بولنے والے والوینا کے درمیان کشیدہ نے 1970 سے شروع ہو کر، 1980، پھر 1988، اور بالآخر 1993 تک، چار مڑوں میں، ملک کا پورا آئینی ڈھانچہ بدل دیا، جس میں کئی نئی آسانی برآوردیں اور نئے علاقائی کاٹیوں پر مشتمل علاقے بنائے۔ یہ نظام آج بھی، اپنے ہی ماہرین کے بقول، 1815 میں دیا نا کنگرس کے فیصلے کے بعد برن میں شامل کیا گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد وہاں میٹھ کی ترقی کے لیے زور پڑا۔ سلسلہ وار ریفٹرز ہڈوں کے بعد، تھیراں سو شہر میں پوری قوم نے اس خطے کو الگ کھینچنے سے حق میں دوٹ دیا، اور یکم جنوری 1956 کو اس کو جوں جوں ریفٹرز کا کئی کئی نئے کیا۔ سارہ سارہ تھی، کئی کئی کرجوئی جوں جوں کا پرفٹنٹ فرامشی بولنے کے بعد، زبان مشترک ہونے کے باوجود، اور دوبارہ راستہ تقریباً ہر بار نا کام رہا ہے، والا ناکی کی وجہ سادہ ہے۔ جس برادری نے اپنی زبان اور شناخت کی پہچان نا تھی، اسے ایک نامبر اتنا ہی بھٹل، انتظامی خانہ تعادیا جاتا ہے۔ مطالبہ تسلیم نہیں ہوتا، صرف ایک سبے بنائے لائق سامنے ہیں ڈرنے کی دیا جاتا ہشت اور فنی، دونوں صورتوں میں۔ تاریخ سے کھنے کا فائدہ یہ ہے کہ قیمت کم ہوتی ہے۔ اپنی غلطیوں سے کھینے کی قیمت بھی جانی جانے کے چرچا کی پڑتی ہے تو کیوں نہ تارن سے سکھا۔ ڈنچ بولنے والے فلیٹرز ز اور فرامشی

سوئٹز لینڈ میں انتظامی حدود کو کھینچ کینے ہیں۔ آئے آپ کو جوں لکھن کی کہانی سامنے۔ برن ایک شہر تھا (اور ہے) اور ساتھ ساتھ کھنچ کینے کا شہلی حد ضروری بولنے والا اور کھنچو تھا، جب باقی برن جرن بولنے والا اور پرفٹنٹ۔ یہ خطہ 1815 میں دیا نا کنگرس کے فیصلے کے بعد برن میں شامل کیا گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد وہاں میٹھ کی ترقی کے لیے زور پڑا۔ سلسلہ وار ریفٹرز ہڈوں کے بعد، تھیراں سو شہر میں پوری قوم نے اس خطے کو الگ کھینچنے سے حق میں دوٹ دیا، اور یکم جنوری 1956 کو اس کو جوں جوں ریفٹرز کا کئی کئی نئے کیا۔ سارہ سارہ تھی، کئی کئی کرجوئی جوں جوں کا پرفٹنٹ فرامشی بولنے کے بعد، زبان مشترک ہونے کے باوجود، اور دوبارہ راستہ تقریباً ہر بار نا کام رہا ہے، والا ناکی کی وجہ سادہ ہے۔ جس برادری نے اپنی زبان اور شناخت کی پہچان نا تھی، اسے ایک نامبر اتنا ہی بھٹل، انتظامی خانہ تعادیا جاتا ہے۔ مطالبہ تسلیم نہیں ہوتا، صرف ایک سبے بنائے لائق سامنے ہیں ڈرنے کی دیا جاتا ہشت اور فنی، دونوں صورتوں میں۔ تاریخ سے کھنے کا فائدہ یہ ہے کہ قیمت کم ہوتی ہے۔ اپنی غلطیوں سے کھینے کی قیمت بھی جانی جانے کے چرچا کی پڑتی ہے تو کیوں نہ تارن سے سکھا۔ ڈنچ بولنے والے فلیٹرز ز اور فرامشی

باپ سے جذباتی لگاؤ دش ہو گیا۔ مہر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ اس نے ملوٹن مہر کا، خود یہ جبر کیا ایک دن شوہر اس پر ہاتھ اٹھانے لگا تو بڑی بیٹی نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا، چھوٹی بیٹی نے ہاتھ اٹھا لیا، چھوٹی بیٹی نے مہر کا ہاتھ پکڑ لیا تو مہر کا غاموشی سمی، لیکن خاموشی اتنا بولی، سالوں سے بہرام دیکم مصل سے بہر مند ہو گیا، اپنی عزت کے لیے کھمبہ ہو گیا۔ بیٹیاں اس ختم کو بھی نہیں مالن کی حفاظت کرتیں، مالن کی حالت کا بوجھتیں۔ بڑی بیٹی باپ کو کھرانے سے روک دیا۔ اس نے غمیل نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ بیوی خاموش رہی۔ اس نے دوسری عزت کے کھمبہ رہنا شروع کر دیا۔ دوسری عزت کے بچے بھی بیوی عزت کے بچوں کے ہم قدم لگے۔ اسے دو گھر بھی چھوڑنا پڑا۔ دوستیوں کا مسافر بچہ منجھوا دھبہ کیا۔ اولاد جن ہوم میں پانڈی۔ وہاں ختم کا بوجھتیں، اس نے ایک ذہنی عزت کے بچوں کی طرف توجہ دینا شروع کر دی۔ خودی کرنے والے کی اخوت محفوظ نہیں۔ انسان عجب مخلوق ہے۔ فرعون بننے دیر نہیں لگا، غرود بننے دیر نہیں لگا۔ تا مگر جراتی تو ہوا یوں ہو جاتا ہے، زندگی ختم کر لینا ہے۔ زندگی ختم کرنے سے معاملات ختم نہیں ہوتے۔ حباب لینے والے نے حباب لینا ہے۔ کیتے ہیں، جو مریاں کے لیے قیامت قائم ہو گئی۔ عدل خیراں عزت سے دم خشی کردار کا لازمی جز ہے۔ کردور کو کردور نہیں سمجھنا چاہیے۔ منصف نازک حوصلے کے اعتبار سے چٹان ہوتی ہے۔ بچہ مصل نہیں

عورت لاچار ہوتی ہے۔ بھائی اور باپ کی طرف دیکھتی، تو اسے لگا مرو کھی سمجھتے کرتے پڑتے ہیں۔ رشتہ رشتہ نہیں سمجھ آیا، زندگی سمجھو ہے۔ دانائی سمجھو نہ کرنے کا نام ہے۔ بچہ کھرے بعد شوہر کے جنون کو قرار دیتی۔ دوسری عورت کو بھی سچ کا کٹر پرانا ہے، مٹی لگنے لگے۔ دوسری سامنے سے ڈرنے کی، جو دوسری شادی کر سکتا ہے۔ وہ تیری بھی کر سکتا ہے۔ زندگی میں ٹھنڈا آگیا تھا۔ مگر عارضی تھا۔ شوہر بھی پہلے جیسا نہ ہوا۔ دوسری عورت

دودھ پیوں سے آتے

عورت لاچار ہوتی ہے۔ بھائی اور باپ کی طرف دیکھتی، تو اسے لگا مرو کھی سمجھتے کرتے پڑتے ہیں۔ رشتہ رشتہ نہیں سمجھ آیا، زندگی سمجھو ہے۔ دانائی سمجھو نہ کرنے کا نام ہے۔ بچہ کھرے بعد شوہر کے جنون کو قرار دیتی۔ دوسری عورت کو بھی سچ کا کٹر پرانا ہے، مٹی لگنے لگے۔ دوسری سامنے سے ڈرنے کی، جو دوسری شادی کر سکتا ہے۔ وہ تیری بھی کر سکتا ہے۔ زندگی میں ٹھنڈا آگیا تھا۔ مگر عارضی تھا۔ شوہر بھی پہلے جیسا نہ ہوا۔ دوسری عورت

دودھ پیوں سے آتے ہے۔ وہ بخوبی جانتی تھی، تھا، اگلی بھائی بھی۔ بھائی خاموش رہتا، بھائی بھی جانتی تھی۔ اس کی چار سالہ بیٹی نہ جانتی تھی وہ جانتی بھی نہ تھی، چار سالہ بیٹی قیتوں کے بارے میں جانتے لیکن اس کی جاہت سے کیا ہوتا تھا؟ بھائی چار سالہ بیٹی کو سمجھانے پر بھتیگی۔ بھائی نے بیرون ملک کا پکڑا ہوا تھا۔ بار بار مرضی "جائے کیوں بھائی ہے؟ پوری کیوں نہیں لنی؟ دودھ پیوں سے آتے ہے۔" وہ حیران رہ گئی، پریشان رہ گئی، اندر سے کہیں بیجان رہ گئی۔ خاموش رہی۔ شکر ادا کیا بھائی نے کئی کئی نہیں مارا۔ کھدویر بھتیجی نے بیٹی بھیجے جائے لی، لی، بھائی نے کان چھوڑ دی۔ اس کی جان میں جان آگئی، لیکن جان میں اس کی کہاں آگئی؟ وہ دودھ پیوں سے آگئی، لاڈلشیں کی سب کچھ چھوڑ کر میاں کے ساتھ پاکستان آ گئی۔ شوہر نہ جانے کیا ہوا، چند ماہ گزرے ہی اس نے دوسری شادی کر لی۔ دوسری عورت کوئی زندگی موقع تلاش کر گئی، اس کی ذہنت کا باعث بنتی۔ سرال نے ہمیشہ ہی ہونا ساتھ دیا۔ پرانی ہو، بھتیجے ہی دیکھتے، شدید پرانی ہو گئی، پرانی ہو گئی، انجانی بھی ہو گئی۔ حباب زندہ تھا، صاحب جائیداد بھی، بیٹی کی پالت نہ دیکھ سکا۔ بیٹی کو لکھ دیا۔ ایک گھر میں باپ سے زیادہ ہاتھ کاظم چلتا تھا، بھائی سے زیادہ بھائی کی بیوی کاظم چلتا تھا۔ اگلی بھائی

تحریک ہاشا ارشاد میری جسمانی ساخت تھوڑی عجیب سی ہے، میری دماغی ساخت کی طرح۔ دماغ تو خیر نظر نہیں آتا پر جسم ڈھکنے کے لیے لباس کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ میرا قد پاکستانی اوسط قد سے معمولی سا زیادہ ہو گا۔ پتیر وہی ہے جسے میں دل خوش کرنے کو "آٹھ لکھ بلڈ" کہہ لیتا ہوں حالانکہ عادتیں سب "دو" چ "بچھ" والی ہیں۔ خیر جسمانی ساخت اور قد ایک ایسے سامنے میں رکھا جا سکتا ہے جو بہت سے اور لوگوں کا ہو گا لیکن میرے کندھے اس سامنے سے نہیں ٹپٹل کھاتے۔ ہوتا ہے کہ بازار سے میض لیں تو جو پیش جسم پر پوری آئے وہ کندھوں سے چھوٹی نہ رہ جاتی ہے، جو کندھوں کے تاپ کی ہودہ ہائی جسم پر بھجوں جاتی ہے۔ کابلی کا تقاضا یہ ہے کہ آن لائن یا دکان سے بنے بنائے اور لا کر ایکسٹار لارن میں سے کوئی ایک آٹھائی پڑتی ہے۔ ہائی مال اور میڈیکل کورڈر سے سامنے۔ کوئی خاص موقع ہو یا حاتم خانی کی قبر پر لالت مار کرسوٹ وغیرہ پہینے کا ہوتو پھر درزی کے پاس پہنچتا ہوں۔ یا قاعدہ تاپ دیتا ہوتا کہ ایسا لباس پہن سکوں جس میں کوئی کمی بیشی نہ ہو۔ درزی کی دکان کا ایک لاکر بکھرے سیوا کھڑا کرے، کی کشش سے آغا ز کرتا ہے۔

ایک درجن ریڈی میڈ صوبوں کا سوال ہے بابا

کندھے اوپر کھینچے، گردن کا زاویہ ٹھیک کیجئے۔ ٹٹے جوڑے۔ بازو یوں دوسے کی طرح مت پیٹنے حکمرانوں کے پاس عموماً دراستے ہوتے ہیں۔ پھیلا رستہ یہ تسلیم کرنا ہے کہ یہ زور اپنی جگہ جتنی ہے، اور اسی انتظامی حدیں اسی حقیقت کے مطابق کھینچی جانی چاہئیں۔ دوسرا اور کئی زیادہ آسان راستہ، یہ ہے کہ اس زور کو محض ایک حدی مسئلہ سمجھ لیا جائے۔ بڑی کاٹیوں کو، آبادی کے بوجھ کے نام پر، برابر برابر گولوں میں کاٹ دیا جائے، جیسے معاملہ کسی وزن کی تقسیم کا ہو۔ یہ تو ہمارے دو گول اور یہ تھارے بڑے گول۔ کیا ہوا جو ایک بیف ہے اور دوسرا چکن۔ اور کیا ہوا اگر ماگتھم نے ٹٹن تھا۔

یہ دوسرا راستہ تقریباً ہر بار نا کام رہا ہے، والا ناکی کی وجہ سادہ ہے۔ جس برادری نے اپنی زبان اور شناخت کی پہچان نا تھی، اسے ایک نامبر اتنا ہی بھٹل، انتظامی خانہ تعادیا جاتا ہے۔ مطالبہ تسلیم نہیں ہوتا، صرف ایک سبے بنائے لائق سامنے ہیں ڈرنے کی دیا جاتا ہشت اور فنی، دونوں صورتوں میں۔ تاریخ سے کھنے کا فائدہ یہ ہے کہ قیمت کم ہوتی ہے۔ اپنی غلطیوں سے کھینے کی قیمت بھی جانی جانے کے چرچا کی پڑتی ہے تو کیوں نہ تارن سے سکھا۔ ڈنچ بولنے والے فلیٹرز ز اور فرامشی

کندھے اوپر کھینچے، گردن کا زاویہ ٹھیک کیجئے۔ ٹٹے جوڑے۔ بازو یوں دوسے کی طرح مت پیٹنے حکمرانوں کے پاس عموماً دراستے ہوتے ہیں۔ پھیلا رستہ یہ تسلیم کرنا ہے کہ یہ زور اپنی جگہ جتنی ہے، اور اسی انتظامی حدیں اسی حقیقت کے مطابق کھینچی جانی چاہئیں۔ دوسرا اور کئی زیادہ آسان راستہ، یہ ہے کہ اس زور کو محض ایک حدی مسئلہ سمجھ لیا جائے۔ بڑی کاٹیوں کو، آبادی کے بوجھ کے نام پر، برابر برابر گولوں میں کاٹ دیا جائے، جیسے معاملہ کسی وزن کی تقسیم کا ہو۔ یہ تو ہمارے دو گول اور یہ تھارے بڑے گول۔ کیا ہوا جو ایک بیف ہے اور دوسرا چکن۔ اور کیا ہوا اگر ماگتھم نے ٹٹن تھا۔

یہ دوسرا راستہ تقریباً ہر بار نا کام رہا ہے، والا ناکی کی وجہ سادہ ہے۔ جس برادری نے اپنی زبان اور شناخت کی پہچان نا تھی، اسے ایک نامبر اتنا ہی بھٹل، انتظامی خانہ تعادیا جاتا ہے۔ مطالبہ تسلیم نہیں ہوتا، صرف ایک سبے بنائے لائق سامنے ہیں ڈرنے کی دیا جاتا ہشت اور فنی، دونوں صورتوں میں۔ تاریخ سے کھنے کا فائدہ یہ ہے کہ قیمت کم ہوتی ہے۔ اپنی غلطیوں سے کھینے کی قیمت بھی جانی جانے کے چرچا کی پڑتی ہے تو کیوں نہ تارن سے سکھا۔ ڈنچ بولنے والے فلیٹرز ز اور فرامشی

دودھ پیوں سے آتے

دودھ پیوں سے آتے ہے۔ وہ بخوبی جانتی تھی، تھا، اگلی بھائی بھی۔ بھائی خاموش رہتا، بھائی بھی جانتی تھی۔ اس کی چار سالہ بیٹی نہ جانتی تھی وہ جانتی بھی نہ تھی، چار سالہ بیٹی قیتوں کے بارے میں جانتے لیکن اس کی جاہت سے کیا ہوتا تھا؟ بھائی چار سالہ بیٹی کو سمجھانے پر بھتیگی۔ بھائی نے بیرون ملک کا پکڑا ہوا تھا۔ بار بار مرضی "جائے کیوں بھائی ہے؟ پوری کیوں نہیں لنی؟ دودھ پیوں سے آتے ہے۔" وہ حیران رہ گئی، پریشان رہ گئی، اندر سے کہیں بیجان رہ گئی۔ خاموش رہی۔ شکر ادا کیا بھائی نے کئی کئی نہیں مارا۔ کھدویر بھتیجی نے بیٹی بھیجے جائے لی، لی، بھائی نے کان چھوڑ دی۔ اس کی جان میں جان آگئی، لیکن جان میں اس کی کہاں آگئی؟ وہ دودھ پیوں سے آگئی، لاڈلشیں کی سب کچھ چھوڑ کر میاں کے ساتھ پاکستان آ گئی۔ شوہر نہ جانے کیا ہوا، چند ماہ گزرے ہی اس نے دوسری شادی کر لی۔ دوسری عورت کوئی زندگی موقع تلاش کر گئی، اس کی ذہنت کا باعث بنتی۔ سرال نے ہمیشہ ہی ہونا ساتھ دیا۔ پرانی ہو، بھتیجے ہی دیکھتے، شدید پرانی ہو گئی، پرانی ہو گئی، انجانی بھی ہو گئی۔ حباب زندہ تھا، صاحب جائیداد بھی، بیٹی کی پالت نہ دیکھ سکا۔ بیٹی کو لکھ دیا۔ ایک گھر میں باپ سے زیادہ ہاتھ کاظم چلتا تھا، بھائی سے زیادہ بھائی کی بیوی کاظم چلتا تھا۔ اگلی بھائی

دودھ پیوں سے آتے ہے۔ وہ بخوبی جانتی تھی، تھا، اگلی بھائی بھی۔ بھائی خاموش رہتا، بھائی بھی جانتی تھی۔ اس کی چار سالہ بیٹی نہ جانتی تھی وہ جانتی بھی نہ تھی، چار سالہ بیٹی قیتوں کے بارے میں جانتے لیکن اس کی جاہت سے کیا ہوتا تھا؟ بھائی چار سالہ بیٹی کو سمجھانے پر بھتیگی۔ بھائی نے بیرون ملک کا پکڑا ہوا تھا۔ بار بار مرضی "جائے کیوں بھائی ہے؟ پوری کیوں نہیں لنی؟ دودھ پیوں سے آتے ہے۔" وہ حیران رہ گئی، پریشان رہ گئی، اندر سے کہیں بیجان رہ گئی۔ خاموش رہی۔ شکر ادا کیا بھائی نے کئی کئی نہیں مارا۔ کھدویر بھتیجی نے بیٹی بھیجے جائے لی، لی، بھائی نے کان چھوڑ دی۔ اس کی جان میں جان آگئی، لیکن جان میں اس کی کہاں آگئی؟ وہ دودھ پیوں سے آگئی، لاڈلشیں کی سب کچھ چھوڑ کر میاں کے ساتھ پاکستان آ گئی۔ شوہر نہ جانے کیا ہوا، چند ماہ گزرے ہی اس نے دوسری شادی کر لی۔ دوسری عورت کوئی زندگی موقع تلاش کر گئی، اس کی ذہنت کا باعث بنتی۔ سرال نے ہمیشہ ہی ہونا ساتھ دیا۔ پرانی ہو، بھتیجے ہی دیکھتے، شدید پرانی ہو گئی، پرانی ہو گئی، انجانی بھی ہو گئی۔ حباب زندہ تھا، صاحب جائیداد بھی، بیٹی کی پالت نہ دیکھ سکا۔ بیٹی کو لکھ دیا۔ ایک گھر میں باپ سے زیادہ ہاتھ کاظم چلتا تھا، بھائی سے زیادہ بھائی کی بیوی کاظم چلتا تھا۔ اگلی بھائی

دودھ پیوں سے آتے ہے۔ وہ بخوبی جانتی تھی، تھا، اگلی بھائی بھی۔ بھائی خاموش رہتا، بھائی بھی جانتی تھی۔ اس کی چار سالہ بیٹی نہ جانتی تھی وہ جانتی بھی نہ تھی، چار سالہ بیٹی قیتوں کے بارے میں جانتے لیکن اس کی جاہت سے کیا ہوتا تھا؟ بھائی چار سالہ بیٹی کو سمجھانے پر بھتیگی۔ بھائی نے بیرون ملک کا پکڑا ہوا تھا۔ بار بار مرضی "جائے کیوں بھائی ہے؟ پوری کیوں نہیں لنی؟ دودھ پیوں سے آتے ہے۔" وہ حیران رہ گئی، پریشان رہ گئی، اندر سے کہیں بیجان رہ گئی۔ خاموش رہی۔ شکر ادا کیا بھائی نے کئی کئی نہیں مارا۔ کھدویر بھتیجی نے بیٹی بھیجے جائے لی، لی، بھائی نے کان چھوڑ دی۔ اس کی جان میں جان آگئی، لیکن جان میں اس کی کہاں آگئی؟ وہ دودھ پیوں سے آگئی، لاڈلشیں کی سب کچھ چھوڑ کر میاں کے ساتھ پاکستان آ گئی۔ شوہر نہ جانے کیا ہوا، چند ماہ گزرے ہی اس نے دوسری شادی کر لی۔ دوسری عورت کوئی زندگی موقع تلاش کر گئی، اس کی ذہنت کا باعث بنتی۔ سرال نے ہمیشہ ہی ہونا ساتھ دیا۔ پرانی ہو، بھتیجے ہی دیکھتے، شدید پرانی ہو گئی، پرانی ہو گئی، انجانی بھی ہو گئی۔ حباب زندہ تھا، صاحب جائیداد بھی، بیٹی کی پالت نہ دیکھ سکا۔ بیٹی کو لکھ دیا۔ ایک گھر میں باپ سے زیادہ ہاتھ کاظم چلتا تھا، بھائی سے زیادہ بھائی کی بیوی کاظم چلتا تھا۔ اگلی بھائی

ای طرح کسی شہری سے فرائض کی ادا کیلگی کا

مطالبہ کسی سطح فوس کا ترجمان یا فائدہ نہیں کرتا بلکہ اس سبق کو نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یا اسے سیاسی مباحث میں نمایاں کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود مطالبہ کا کوئی فائدہ کسی شہری کو یہ کہہ کر اس کا حق دینے سے انکار نہیں کر سکتا کہ کیا اس نے اپنے فرائض ادا کیے ہیں اور نہ ہی کسی شہری کو ریاست کے ساتھ اختلاف کی صورت میں خداری یا ملک دشمن جیسے الزامات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ الفاظ جمہوری معاشروں کی لغت سے نکال دیے گئے ہیں لیکن پاکستان میں انہیں زبان زد عام ہی نہیں کیا گیا بلکہ ملک دشمنی یا دین سے بغاوت کے الزام عائد کرنے اور کسی متوجہ کو سزا دینے کا بھی دے دیا گیا ہے۔ ریاست اور ملک کا انتظامی ڈھانچہ عام طور سے ایسے معائن کے خلاف کوئی اقدام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس لیے کسی کی اقلیت کی ہستی پر حملہ ہو سکتا ہے، کبھی کسی قبرستان میں قبریں اکھاڑی جاسکتی ہیں اور کبھی لڑکیاں خوا کر کے انہیں اپنے نکاح میں لانے والے اسلام کے عقائد قرار دیے جا سکتے ہیں۔ انصاف اور قانون کی بنیاد پر کام کرنے والی ریاستیں، ایسے "حقوق کے پروانے جاری نہیں کرتیں۔

کو خارج کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کا نو جوان اگر آئینی حقوق کی پامالی دیکھے تو وہ جنت زمزمہ پر یا یونیورسٹی کے پیس سڑکوں پر نکل کر ریاستی پالیسیوں کے سامنے بند ہانڈے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان کی کہانی روز اول سے ہی مختلف رخ اختیار کر گئی۔ قیام پاکستان کے محض ایک ہفتے بعد 12 اگست 1947ء کو مسوہر صدر مئی خیر پختونخوا میں ڈاکٹر خان کی ختف حکومت کی برطانی نے اس بات کا اشارہ دے دیا تھا کہ نئے ملک میں اختلاف رائے اور مزاحمت کو کسی نظر سے دیکھا جائے گا۔ وہ لوگ جنہوں نے انگریز سامراج کے خلاف جی توڑ جدوجہد کی تھی اور جو مزاحمت کی علامت سمجھے جاتے تھے انہیں دھیرے دھیرے دیوار سے لگا دیا جائیگی اور ان کی زوال کا اگلا مرحلہ اس وقت آیا جب 11 اگست 1947ء کے قائد اعظم کی تاریخی تقریر پر یونٹس پشت ڈال دیا گیا جس میں ریاست کو مذہب سے بالاتر کر کے تمام شہریوں کے مساوی حقوق کا منشور دیا گیا تھا۔ اس کے چند ہی ماہ بعد قرارداد مقاصد کی منظوری نے سیاست میں مذہبی طبقات کے اس کردار کی بنیاد رکھ دی جس نے وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی اور معاشی شعور کو ہر طرح منظر بن گیا۔ پھر کوٹ شاہی اور فوجی آمریت کے گھمبیرے دور کا نام زمر یاں بند کر دیں جہاں سے سیاسی شعور اور عوامی قیادت نے جنم لیتا تھا۔ خاص طور پر جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں جو معاشرتی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا

کو خارج کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کا نو جوان اگر آئینی حقوق کی پامالی دیکھے تو وہ جنت زمزمہ پر یا یونیورسٹی کے پیس سڑکوں پر نکل کر ریاستی پالیسیوں کے سامنے بند ہانڈے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان کی کہانی روز اول سے ہی مختلف رخ اختیار کر گئی۔ قیام پاکستان کے محض ایک ہفتے بعد 12 اگست 1947ء کو مسوہر صدر مئی خیر پختونخوا میں ڈاکٹر خان کی ختف حکومت کی برطانی نے اس بات کا اشارہ دے دیا تھا کہ نئے ملک میں اختلاف رائے اور مزاحمت کو کسی نظر سے دیکھا جائے گا۔ وہ لوگ جنہوں نے انگریز سامراج کے خلاف جی توڑ جدوجہد کی تھی اور جو مزاحمت کی علامت سمجھے جاتے تھے انہیں دھیرے دھیرے دیوار سے لگا دیا جائیگی اور ان کی زوال کا اگلا مرحلہ اس وقت آیا جب 11 اگست 1947ء کے قائد اعظم کی تاریخی تقریر پر یونٹس پشت ڈال دیا گیا جس میں ریاست کو مذہب سے بالاتر کر کے تمام شہریوں کے مساوی حقوق کا منشور دیا گیا تھا۔ اس کے چند ہی ماہ بعد قرارداد مقاصد کی منظوری نے سیاست میں مذہبی طبقات کے اس کردار کی بنیاد رکھ دی جس نے وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی اور معاشی شعور کو ہر طرح منظر بن گیا۔ پھر کوٹ شاہی اور فوجی آمریت کے گھمبیرے دور کا نام زمر یاں بند کر دیں جہاں سے سیاسی شعور اور عوامی قیادت نے جنم لیتا تھا۔ خاص طور پر جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں جو معاشرتی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا

کو خارج کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کا نو جوان اگر آئینی حقوق کی پامالی دیکھے تو وہ جنت زمزمہ پر یا یونیورسٹی کے پیس سڑکوں پر نکل کر ریاستی پالیسیوں کے سامنے بند ہانڈے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان کی کہانی روز اول سے ہی مختلف رخ اختیار کر گئی۔ قیام پاکستان کے محض ایک ہفتے بعد 12 اگست 1947ء کو مسوہر صدر مئی خیر پختونخوا میں ڈاکٹر خان کی ختف

